چہرہ بہ چہرہ
نعیم اظہر

نعیم اظہر کی غزل تمنا کی آوارہ خرامی سے عبارت ہے، وہ فطرت کے حسن اور کائنات کی وسعت کو، میں، کے آئینے میں منعکس کرتا ہے اور پھر اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر اپنی ذات کا نور اور حیات کا شعور "تُو" کے سراپا میں متشکّل کر دیتا ہے۔ شاعر اپنی ذات کی تلاش میں اپنے مطمع نظر کی تلاش کرتا ہے اور اپنے مطمح نظر کے آئینے میں اُسے خود آگہی کا چراغ روشن نظر آتا ہے، یوں نعیم اظہر کی غزل روایتی معاملہ بندی کی تنگنا کو عبور کر کے من و تُو کے نو بنو جہان آباد کرتی چلی جاتی ہے، جہاں حسن کی پیکر تراشی اور عشق کی جلوہ گری ایک ہی آئینے کے دو عکس نظر آتے ہیں، جو ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہوئے بھی ہم آمیز و ہم رنگ ہیں۔ نعیم اظہر کی تمنا کا یہ حسین اور لامحدود سفر جاری ہے اور جاری رہے گا کہ اُس کے ہاں تمنا اور عرضِ تمنا ایک تڑپ، ایک خلش اور ایک لازوال حرکت و حرارت کا نام ہے ؎

تکتی ہے میری راہ ترے راستوں کی دھول
جیسے مرے بدن پہ کوئی بھی قبا نہیں

نعیم اظہر ایک ایسے جدید غزل گو شاعر کی حیثیت سے اُبھر رہا ہے جس نے بے چہرگی کے اس دور میں اپنی طہارتِ فن اور خلوصِ نظر کی بدولت اپنے اور اپنے آئیڈیل کے چہرے کو نہ صرف مسخ ہونے سے بچا لیا ہے بلکہ اس کی آب و تاب کو بھی برقرار رکھا ہے اور یہی نعیم اظہر کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔

**جمیل ملک**

۲۶ ستمبر ۱۹۷۷ء

# چہرہ بہ چہرہ

نعیم اظہر

نوروز پبلشرز، لاہور

## ضابطہ


| | |
|---|---|
| تعداد | ایک ہزار ایک سو |
| حقوق | بحق مصنّف محفوظ |
| اشاعت | ۱۹۷۷ء |
| ناشر | شمیم افضل |
| کتابت | محمد حسین (شاہ) |
| مطبع | ورک مین پرنٹرز، لاہور |
| قیمت | بیس روپے |
| سول ایجنٹ | آئینہ ادب، لاہور |


---

## سوانحی خاکہ


| | |
|---|---|
| نام | نعیم اظہر |
| ولدیت | پیر انور علی شاہ انور ہاشمی |
| تاریخ پیدائش | ۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۳ء |
| مقام پیدائش | ملک پور (ضلع شیخوپورہ) |
| پتہ | قلعہ ستیا۔ منڈی مریدکے (ضلع شیخوپورہ) |
| فون | ۴۷۴۰۰ـ۷۔۵۰۵ـ۷۰۰ |

# انتساب

اُس کے نام جس کی بے پایاں نفرت ہمیشہ
مجھے بے انتہا محبّت کے روپ میں نظر آئی

اس طرح بکھری مری چہرہ بہ چہرہ داستاں
دہر اس کو آپ بیتی کہہ کے دہرانے لگا

# فہرست


مقدمہ — عارف عبدالمتین — ۱۳

۱ — وہ سراپا حسن بھی ہے، عشق کا جلوہ بھی ہے — ۲۳

۲ — جہاں میں رکھی ہے میں نے خود آگہی کی طرح — ۲۵

۳ — اپنی تلاش بھی مجھے تیری تلاش ہو — ۲۷

۴ — میں محبت ہوں تو مجھ کو دل کے زنداں سے نکال — ۲۹

۵ — کل جہاں پر تھا ترے پیار کی عظمت اوڑھے — ۳۱

۶ — مانا کہ تو نے حرفِ محبت کہا نہیں — ۳۳

۷ — بجا کہ شعلہ کی صورت میں مشتعل نہ ہوا — ۳۵

۸ — کسی کی یاد کے تیور گلاب ہوتے گئے — ۳۷

۹ — بکھر رہا ہے نیا رنگ ان فضاؤں سے — ۳۹

۱۰ — میں گلکدۂ زیست میں آوارہ ہُوا ہوں ۴۱
۱۱ — تڑپ رہا ہوں کبھی مجھ سے ہم کلام تو ہو ۴۳
۱۲ — رُک کے جب بھی میں رہِ الفت میں سستانے لگا ۴۵
۱۳ — رونے سے گرچہ آنکھ کے پردے تو دُھل گئے ۴۷
۱۴ — یہ سارا انقلاب اُسی کی نظر کا تھا ۴۹
۱۵ — ہر ایک گام پہ دیکھے ہیں میں نے اپنے نشاں ۵۱
۱۶ — خوشبو کی طرح تو مرے جب ہاتھ نہ آیا ۵۳
۱۷ — نظر اپنی ستاروں سے ہٹا لیتا تو اچھا تھا ۵۵
۱۸ — جہاں کھویا وہیں پایا گیا ہوں ۔ ۵۷
۱۹ — میں آشنائی کا غم کس طرح بیاں کرتا ۵۹
۲۰ — یہ زندگی ہے ترے ہاتھ میں شراب نہیں ۶۱
۲۱ — زمانے بھر کے محبت میں زخم کھائے ہیں ۶۳
۲۲ — ہائے کیا چہرے تھے جو میری نظر کو بھا گئے ۶۵
۲۳ — زندگی کا نشاں لہو تک ہے ۶۷
۲۴ — ترے لیے نئی دنیا بسائے بیٹھا ہوں ۶۹
۲۵ — کیا عجب سیلِ رنگ و بُو ہو گا ۷۱
۲۶ — تیرے ہر رنگ میں اب جسم بھی ترکتا ہے ۷۳
۲۷ — جب بھی دل میں تری یادوں کو مچلتے دیکھا ۷۵
۲۸ — دکھا دے گردشِ دوراں نئی اب راستہ کوئی ۷۷

۲۹ — شبِ ہجراں مجھے رنگِ سحر تک تو جگا لائی ۷۹
۳۰ — خونِ دل سہمی ہوئی آنکھ نے ٹپکایا ہے ۸۱
۳۱ — حنائی انگلیاں یاد آ رہی ہیں ۸۳
۳۲ — دہر میں اخلاص کو ڈھونڈوں کہاں ۸۵
۳۳ — وہ بے رخی کا پہنے لبادہ نکل گیا ۸۷
۳۴ — اپنا سوچا کیا کرے کوئی ۸۹
۳۵ — قربتیں جب تک رہیں گلزار کی ۹۱
۳۶ — مرے ہی روپ میں وہ ڈھل رہا ہے ۹۳
۳۷ — رہِ وفا میں ہیں آلام زندگی کے لیے ۹۵
۳۸ — اُن کا سودائے ستم تا بہ ابد خام رہا ۹۷
۳۹ — ہجومِ غم میں پھر دل کھل اُٹھا ہے ۹۹
۴۰ — تلخیٔ حالات نے پینے پہ اُکسایا مجھے ۱۰۱
۴۱ — اُسی کی یاد رہی دل میں حرزِ جاں ہو کر ۱۰۳
۴۲ — شکوہ کسی سے اب مری عادت نہیں رہا ۱۰۵
۴۳ — مجھے عزیز یہ تنہائی ہوتی جاتی ہے ۱۰۷
۴۴ — سکوں ملتا ہے ذہنوں کی جلن کو ۱۰۹
۴۵ — شاید کہ میرے پاس وہ قلب و نظر نہیں ۱۱۱
۴۶ — نزادِ وجود مرا انکشاف ہو جیسے ۱۱۳
۴۷ — اُن کی نسبت سے محبت کا گنہگار نہ کر ۱۱۵

۴۸ — مرا دل بے کلی میں اس قدر ہے ۱۱۷
۴۹ — خود کیا جرم وفا، اس کی سزا ہو کہ نہ ہو ۱۱۹
۵۰ — سوچتا ہوں کہ مجھے ملتی نہ یوں تیری ضیا ۱۲۱
۵۱ — نور بن کر مرے ماتھے پہ سنور جاتا ہے ۱۲۳
۵۲ — پایا تو میں نے خوب تری کائنات کو ۱۲۵
۵۳ — ایسا موسم ہے کہ کھلتے نہیں کردار ابھی ۱۲۷
۵۴ — کبھی تو میرے نصیبوں میں وہ گھڑی ہو گی ۱۲۹
۵۵ — میرا وجود صورتِ خوشبو بکھر گیا ۱۳۱

فردیات ۱۳۵

# مقدمہ

اس میں شک نہیں کہ محبّت کو غزل کے سلسلے میں اساسی حیثیت حاصل ہے مگر المیہ یہ رونما ہوا کہ کلاسیکی غزل نے ایک طویل مدّت تک اپنے آپ کو محبّت کے شخصی تصوّر تک محدود رکھا، اور یوں وہ ایک خود ساختہ حصار میں محصور ہو کر رہ گئی۔ یہ کچھ زیادہ عرصے کی بات نہیں جب ہماری اس انتہائی پُرمایہ صنفِ سخن نے اپنی مذکورہ حد بندی کو توڑا اور وہ محبّت کے اجتماعی تصوّر سے ہمکنار ہو کر اپنی معنوی توسیع کے اہتمام پر قادر ہوئی۔ ہر چند کہ محبّت کے اول الذکر تصور کی قدر و قیمت سے انکار فن کی قلمرو میں کفر کے مترادف ہے اور اس کے حوالے سے ہماری غزل نے انسانی فکر و جذبہ کی جن رفعتوں کو چھوا ہے، ان کی وقعت و اہمیت سے روگردانی سلامتیٔ فکر اور حُسنِ نظر کی موجودگی میں ناممکن ہے، تاہم بلوغتِ ذہن اور عمرانی آگہی کے تقاضوں کی روشنی میں اس فرخندہ حقیقت کا اظہار بھی ناگزیر ہے کہ محبّت کے مؤخر الذکر تصوّر نے غزل کو ایک ایسا کائناتی کینوس فراہم کیا، جس پر ابنِ آدم کے متنوع موضوعی اور معروضی مسائل کو آفاقی الوان و خطوط میں مرتسم کرنے کے امکانات ہویدا ہوئے —— اگرچہ جدید غزل نگاروں میں ایک محترم طبقہ ایسا ہے جس نے غزل گوئی کو محبّت کی غربال کے استعمال سے

مشروط نہیں کیا، اور اپنے داخلی و خارجی تجربات کی براہِ راست ترسیل کو ترجیح دی ہے اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس نے اپنے اس دانشگاف اسلوب سے غزل کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ بھی کیا ہے، تاہم جدید غزل گوؤں کا ایک بڑا اور رمز طبقہ غزل کے مخصوص توسیعی مزاج کے عملی احترام کے جلو میں تخلیقِ فن کے مراحل طے کر رہا ہے اور انفس و آفاق کے ضمن میں اپنے عمل اور ردِّعمل کو اس محبّت کے توام سے آمیز کر کے شعر کے سانچے میں ڈھال رہا ہے، جو ہمیشہ ذات سے کائنات کی طرف مائلِ رم رہتی ہے اور یوں غزل کے بیش قیمت اثاثے کی کمیّت کو بڑھانے کا اہتمام کر رہی ہے ـــــ نعیم اظہر جدید غزل نگاروں کے اسی طبقہ کے ایک ایسے سزاوارِ اعتنا رکن ہیں، جن کی انفرادیت میں اعتبارادر اسلوب میں رعنائی ہے!

آئیے اب ہم سب سے پہلے اس محبّت کی معنویت سے شناسائی حاصل کریں، جو نعیم اظہر کی غزل گوئی کے لئے مستحکم بنیاد فراہم کرنے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے ـــــ محبّت اُن کے ہاں دراصل رابطوں کے اس لامتناہی سلسلے کا دوسرا نام ہے، جس کا نقطۂ آغاز محبوب کی وہ شخصیت ہے، جو حُسن و رعنائی کا دلآویز پیکر بن کر آئینہ کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے اور وجدان و شعور کے اُن گنت تلازموں کے حوالے سے ہمیں پہلے مرحلے پر خود شناسی اور آخری مرحلے پر کائنات شناسی کی قدرت سے فیض یاب کرتی ہے، گویا نعیم اظہر کے ہاں محبّت ابتدائے کار میں انکشافِ ذات کے حیرت انگیز عمل کا دلپذیر مظہر بن کر اُبھرتی ہے اور اُن سے اس نوع کے خوبصورت اشعار کہلواتی ہے

میری آنکھیں اپنا پیکر دیکھ کر چندھیا گئیں
آئینہ بن کر وہ میرے سامنے جب آ گئے

مگر یہ آئینہ بذاتِ خود کوئی جامد اور غیر متحرک چیز نہیں ہے بلکہ ایک ایسی سیال شے ہے

جسے سراپا تحرک کہا جا سکتا ہے۔ اس آہوئے رمیدہ کی تلاش اور اس کو رام کرنے کے مرحلے بڑے جانکاہ بھی ہیں اور آسودگی بخش بھی اور انہیں طے کرنا حصولِ مقصد کے لئے ناگزیر ہے۔ نعیم اظہر کی غزل تلاش کی سرگرانی اور بازیافت کی سرشاری دونوں کے جمالیاتی اظہار کا مرقع ہے۔ تلاش کے حوالے سے ان کے تین شعر ملاحظہ فرمایئے۔ وہ کہتے ہیں :

اپنی تلاش بھی مجھے تیری تلاش ہو،
کچھ اس طرح سے میری تری بود و باش ہو!
ہو کائنات میری نگاہوں کے سامنے
اور مجھ کو ذرّے ذرّے میں تیری تلاش ہو!
قریہ قریہ تجھے میں ڈھونڈوں گا
میرا افسانہ کو بہ کو ہو گا !

اور اب بازیافت کے حوالے سے نعیم اظہر کی اس جمالیاتی حظ اندوزی کا اندازہ کیجیے جس کی ترسیل ذیل کے شعر کی وساطت سے بطریقِ احسن ہو رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں :

یوں بھی اُترا ہے کوئی روح کی گہرائی میں
جس طرح جھیل میں مہتاب اُتر جاتا ہے

مگر واضح رہے کہ نعیم اظہر اُن وارفتگانِ شوق میں سے نہیں ہیں، جو بازیافت کے نشہ میں کھو کر اس کی گوناگوں پیچیدگیوں سے صرفِ نظر کر جاتے ہیں اور اس حقیقت سے بے خبر ہو کر رہ جاتے ہیں کہ ان ژولیدگیوں کے طفیل کبھی کبھی بازیافت التباس یافت میں ضم ہو کر رہ جاتی ہے، یگانگت کے آبِ حیات میں بیگانگی کا زہرِ ہلاہل گھل جاتا ہے، وصل کے کیف میں فراق کا کرب در آتا ہے اور قربتوں کی طمانیت میں فاصلوں کی تشنگی طلوع ہو جاتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر نعیم اظہر کا

مزاج تجزیاتی ہے اور وہ حقائق سے پردہ ہٹانے کے انتہائی ادق فن سے اس حد تک آشنا ہیں کہ محسوس ہوتا ہے گویا وہ بصارت کے زینے پر قدم دھرتے دھرتے بصیرت کے اوج تک رسائی حاصل کر رہے ہیں۔ میں اپنے معروضات کی تصدیق کے لئے صرف دو شعر پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا" وہ کہتے ہیں:

میں جس کو اپنا سمجھ کر تلاش کرتا ہوں
مجھے ملا بھی اگر وہ تو اجنبی کی طرح
اس پہ پروازِ تخیل کیا کرے
فاصلے جب قربتوں میں ہوں نہاں

نعیم اظہر کا وہ انداز، جو انہیں حقیقت کو ایک سے زیادہ زاویوں سے مشاہدہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے، اُن کے دل میں کبھی کبھی اسی جاں نواز خواہش کو بھی جنم دیتا ہے جس کے تحت انہیں مطلوب کو طالب کی نگاہ کی بجائے خود مطلوب کی نظر سے دیکھنے کی تمنا گدگدانے لگتی ہے اور اُن کے لبوں پر مخصوص قسم کے شاداب شعر رواں ہو جاتے ہیں۔ اس قبیل کا ایک شعر آپ بھی ملاحظہ فرمایئے وہ کہتے ہیں:

انہیں، انہیں کی نگاہوں سے میں کبھی دیکھوں
فسردہ دل میں یہ حسرت چھپائے بیٹھا ہوں

مگر واضح رہے کہ نعیم اظہر کا کلام یافت کے التباس کا ہی نہیں حقیقی یافت کے تجربے کا بھی مظہر ہے۔ اس تجربے کے دوران میں اُن کی روح کے چمنستان میں البیلی امنگوں کے شگوفے پھوٹنے لگتے ہیں اور اچھوتی آرزوؤں کے غنچے چٹکنے لگتے ہیں اور اُن کے ہونٹوں سے ایسے شعر پھول بن کر جھڑنا شروع ہو جاتے ہیں، جن کے رنگ و بو ہمیں اپنی گمیابی کا احساس

دلانے پر کمر بستہ نظر آتے ہیں۔ اس نوع کا ایک شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیے نعیم اظہر کہتے ہیں:

جی چاہتا ہے چُوم لوں میں فرطِ شوق سے
وہ لب جو مجھ کو دیکھ کے حیرت سے کھُل گئے

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، نعیم اظہر اُن جدید غزل نگاروں میں سے ہیں جن کے نزدیک محبّت کو ذاتی سطح سے اٹھا کر کائناتی سطح پر استوار کرنے ہی میں فن اور زندگی کی فلاح کا راز مضمر ہے، گویا کہ وہ محبت کی تنگنائے کو انسانی اخوت کے بحرِ بیکراں میں تبدیل کر دینے کے قائل ہیں۔ نعیم اظہر کے اس نظریہ کی جامعیت اور ہمہ گیریت نے اُن کی شاعری کو ترقی پسندیت کا وہ سہانا روپ ارزانی کیا ہے، جو اس دردمندی اور غمگساری سے عبارت ہے، جس کے وسیلے سے فنکار سماج کی ظالم و قاہر قوتوں کا دشمن اور مظلوم و مقہور قوتوں کا دوست بن جاتا ہے، وہ خیر کے علمبرداروں کا حامی اور شر کے پرچم برداروں کا مخالف قرار پاتا ہے اور یوں جہادِ زیست میں اس درخشاں شرکت کا اہتمام ہو جاتا ہے، جو ہر باضمیر انسان کے لئے سرمایۂ افتخار کی حیثیت رکھتی ہے، محبّت کی اس آفاقیت نے نعیم اظہر سے جو اشعار کہلوائے ہیں اُن کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے، وہ کہتے ہیں:

شبِ سیہ کو پرکھنے کی آرزو ہے مجھے
سما بھی جا مری آنکھوں میں روشنی کی طرح

قدم قدم پہ جلائے ہیں زندگی کے چراغ
خیال یہ تھا کہ ہر گھر میں روشنی ہوگی

گرائی جائے نہ بجلی نہ آشیانے جلیں
مرے چمن میں بھی ایسا کوئی نظام تو ہو

زرد چہروں کے پسِ پردہ بھی دیکھ
سرخیاں شاید جنم لے لیں وہاں!

یُوں تو مذکورہ بالا اشعار میں "شبِ سیہ" "روشنی" "چراغ" "بجلی" "آشیانے" "شمع" اور "زرد چہروں" کے حوالے سے نعیم اظہر نے بڑے ایمائی انداز میں اپنی عمرانی آگہی، اپنے طبقاتی شعور اور اپنی ہمدردیوں کی جہت کا اظہار کیا ہے تاہم پہلے دو اشعار میں روشنی کا لفظ بالخصوص توجہ طلب ہے، کیونکہ یہ اس خیر کی علامت کے طور پر ابھرا ہے، جو شخصی محبت کے ترفع سے اپنی اضافی حیثیت کے لامحدود فروغ کی بدولت اس مطلق مرتبہ پر فائز ہونے کے جملہ امکانات رکھتی ہے، جہاں سے اَن گنت روحانی تلازمے ظہور میں آتے ہیں، اور کبھی ہمارے ذہن میں بائبل کے اس معنی خیز بیان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

1- IN THE BEGINNING GOD CREATED THE HEAVENS AND THE EARTH. 2- THE EARTH WAS WITHOUT FORM AND VOID, AND DARKNESS WAS UPON THE FACE OF THE DEEP; AND THE SPIRIT OF GOD WAS MOVING OVER THE FACE OF THE WATER. 3- AND GOD SAID, "LET THERE BE LIGHT;" AND THERE WAS LIGHT. AND GOD SAW THAT THE LIGHT WAS GOOD; AND GOD SEPARATED THE LIGHT FROM THE DARKNESS. [ل]

---

[ل] THE OLD TESTAMENT - GENESIS

اور کبھی ہمارا دھیان قرآن کے ان بلیغ ترین الفاظ کی طرف جاتا ہے :
"اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" لہ

اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ فن کا یہی وہ مقام محمود ہے، جہاں پر استادہ ہو کر فنکار انسانی روحوں کے مشترک احساسات و داعیات پر اپنی محکم گرفت کے ادراک کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ

اس طرح بکھری مری چہرہ بہ چہرہ داستاں
دہر اس کو آپ بیتی کہہ کے دہرانے لگا

نعیم اظہر نے یہ شعر کہتے ہوئے اسی مقام محمود پر اپنی استادگی کا مظاہرہ کیا ہے اور یوں اپنے مجموعۂ کلام کے نام کا ایسا معنوی جواز فراہم کیا ہے، جس کا قبول اس کی وسیع پذیرائی کا معتبر ضامن بن سکتا ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ مقام پر استواری کا حوالہ عام طور پر احساسِ تکمیل کی جس آسودگی کو ظہور میں لانے کا موجب بن جایا کرتا ہے، نعیم اظہر کے کلام سے اس کا سراغ نہیں ملتا، بلکہ اس کے برعکس اُن کی شاعری میں جا بجا عدمِ تکمیل کا وہ کرب نمایاں ہے، جو اُن کے قارئین کو اس امر سے واقفیت بہم پہنچاتا ہے کہ بقول اقبال

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہ اس کربِ ناتمامی کی شعری ترسیل کا مثبت نتیجہ ہے کہ ہم ان کے اشعار کے مطالعہ سے اس ذہنی طمانیت کا شکار نہیں ہوتے، جو انسان کو بالآخر جمود در جمود سے ہمکنار کر دیتی ہے، بلکہ اس

---

لہ سُوْرَۃُ النُّوْر

تلخی بے اطمینانی کا تجربہ کرتے ہیں، جس کے بطن سے ابنِ آدم کو نشو و ارتقاء کے جمیل پیکر طلوع ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں نعیم اظہر کے دو اشعار مثالاً ملاحظہ فرمایئے وہ کہتے ہیں:

ہر رات میں نے چاند اچھالے فضاؤں میں
لیکن مرے ہی گھر سے اندھیرا چھٹا نہیں
بہت لائے گئے ہیں چاند تارے آسمانوں پر
مگر پھر روشنی میری زمیں تک کیوں نہیں آئی

ظاہر ہے کہ جو شخص فضاؤں میں چاند اچھالنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس میں اندھیرے سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی ہو، وہ بالآخر زمین پر اس روشنی کے نزول کا مشاہدہ کر ہی لیتا ہے جسے اس نے خیرِ مطلق کی علامت کے طور پر حرزِ جاں بنا رکھا ہو! —— میں اس لطیف مشاہدے سے نعیم اظہر کی فیض یابی کا تمنائی ہی نہیں بلکہ اُن کے فن کی وساطت سے اس میں شرکت کا آرزومند بھی ہوں، لہٰذا قدرتی طور پر میں اُن کے دوسرے مجموعۂ کلام کا بے تابی سے منتظر رہوں گا!

عارف عبد المتین
۱۶ رجون ۱۹۷۷ء

# غزلیات

○

وہ سراپا حسن بھی ہے عشق کا جلوہ بھی ہے،
پھول سا لگتا ہے لیکن رُوح میں چُبھتا بھی ہے!

مجھ کو خوشبو آ رہی ہے ان در و دیوار سے،
غنچۂ اُمید جیسے اب یہاں کھِلتا بھی ہے!

کیوں نہ اس میں غرق کر دوں میں زمانے بھر کا دُکھ،
اے مری مجبوریو! کہتے ہیں دل دریا بھی ہے!

میں گلوں کو روپ بخشوں اور خود بنجر رہوں،
قطرۂ شبنم ہوں جس میں وسعتِ صحرا بھی ہے!

مجھ کو جلنا ہے کہ بہ جانا ہے تنکے کی طرح،
دل میں اک سیلاب بھی ہے اور اک شعلہ بھی ہے!

مسخ کر دے گا تو اظہرؔ کیا دکھائے گا اُسے،
اس جہانِ آرزو کا دیکھ اک چہرہ بھی ہے!

---

○

جہاں میں رکھی ہے میں نے خود آگہی کی طرح،
رہا ہے پیشِ نظر آئینہ کسی کی طرح!

میں کس طرح سے پکاروں تجھے، تُہی بتلا،
مری صدائیں بکھرتی ہیں خامشی کی طرح!

شبِ سیہ کو پرکھنے کی آرزو ہے مجھے،
سما بھی جا مری آنکھوں میں روشنی کی طرح!

میں تیرے غم کو سمجھتا رہا ہوں غم اپنا،
مرے لبوں پہ بکھر جا کبھی ہنسی کی طرح!

یہ آرزو ہے کہ اک دن اُفق پہ ہو کے طلوع،
ترے بدن کو سجاؤں میں چاندنی کی طرح!

غبار سا جو تری رہگزر سے اُٹھا تھا،
وہ اب بھی ثبت ہے ہونٹوں پہ تشنگی کی طرح!

میں جس کو اپنا سمجھ کر تلاش کرتا تھا،
مجھے ملا بھی اگر وہ تو اجنبی کی طرح!

چھپا رہا ہوں ہر اک دل میں اپنا پیار اظہرؔ،
کہ چھن نہ جائے کہیں یہ بھی ہر خوشی کی طرح!

○

اپنی تلاش بھی مجھے تیری تلاش ہو،
کچھ اس طرح سے تیری، مری بود و باش ہو!

سینے کا کرب کھنچ کے نگاہوں میں آگیا،
شاید پھر آج کوئی نیا راز فاش ہو!

اب تک ہے اپنے سامنے آنے کی آرزو،
وہ آئینہ دکھا کہ نہ جس میں خراش ہو!

دل کو ہے دل سے راہ، سُنا ہے بہت مگر،
کچھ ایسی رسم و راہ یہاں پر بھی کاش ہو!

لفظوں میں ڈھال دوں میں ترے خد و خال کو،
ڈرتا ہوں پاس ہی نہ کوئی بُت تراش ہو!

جس سے چھپا رہا ہوں میں اپنی شکستگی،
ممکن ہے وہ بھی میری طرح پاش پاش ہو!

ہو کائنات میری نگاہوں کے سامنے،
اور مجھ کو ذرّے ذرّے میں تیری تلاش ہو!

—

○

میں محبت ہوں تو مجھ کو دل کے زنداں سے نکال،
میں زمانے کو نوازوں، مجھ کو لمحے میں نہ ٹال!

میرے غم کی کوکھ سے پھوٹیں گی کرنیں پیار کی،
میرے شوقِ جستجو کو سرد خانے میں نہ ڈال!

کیوں چلا ہے توڑ کر میری تمنا کا بھرم،
روشنی دے گا مجھے اب کونسی رُت کا خیال!

جانے والے غیر کی جانب ترے اُٹھتے قدم،
روند جائیں کاش میری حسرتوں کے خدوخال!

تیرا پیکر آ گیا لے کر کئی اُجلے جواب،
جب بھی اپنے سامنے اُبھرا ہوں میں بن کر سوال!

غم کے شعلے آ چکے ہیں صبر کی دہلیز تک،
تو پگھل جائے نہ اظہرؔ اپنے پیکر کو سنبھال!

---

○

کل جہاں پر تھا ترے پیار کی عظمت اوڑھے،
آج بیٹھا ہوں وہیں دردِ ندامت اوڑھے!

اپنی ویران بہاروں کا تقاضا ہے کہ پھر،
ہاتھ ہوں تیشہ بکف، دل ہو محبّت اوڑھے!

میری بیدار شبی نے جسے ترتیب دیا،
آرزو ہے کہ وہی خواب حقیقت اوڑھے !

کیف برساتی ہوئی صبح کی آغوش میں پھر،
میں نے ہر پھول کو دیکھا تری صورت اوڑھے!

کیا خبر تھی کہ مجھے جاں سے گزرنا ہوگا،
میں تو اس شہر میں آیا تھا ضرورت اوڑھے!

سات رنگوں نے کیا حل کے زمانہ روشن،
میں اکیلا ہی رہا یاس کی رنگت اوڑھے!

میرے بیدار دریچوں میں نہ جھانکا کوئی،
کتنے بے تاب ارادے رہے فرصت اوڑھے!

اپنا کردار رہا شمع کی صورت انظر،
ہم بہر حال جلے چہرے پہ شفقت اوڑھے!

○

مانا کہ تُو نے حرفِ محبّت کہا نہیں،
لیکن یہ درد کیا ہے، جو دل سے جدا نہیں!

کیوں جل رہا ہوں تیرے تغافل کی آگ میں،
جب تجھ سے میرا کوئی تعلّق رہا نہیں!

تکتی ہے میری راہ ترے راستوں کی دُھول،
جیسے مرے بدن پہ کوئی بھی قبا نہیں!

ہر رات میں نے چاند اُچھالے فضاؤں میں،
لیکن مرے ہی گھر سے اندھیرا چھٹا نہیں!

طے کر چکا ہوں تیرے لیے اتنی منزلیں،
اب میرے سامنے بھی کوئی راستہ نہیں!

اظہرؔ مری تو اتنی ہی رودادِ عشق ہے،
پانی میں ڈوب کر مجھے پانی ملا نہیں!

—

○

کسی کی یاد کے تیور گلاب ہوتے گئے،
اسی جلاؤ میں ہم آب آب ہوتے گئے!

ہمیں تو زیست کے لمحوں نے یوں نوازا ہے،
حقیقتوں میں رہے اور خواب ہوتے گئے!

کٹھن اندھیروں میں جاری تھا زندگی کا سفر،
نصیب اپنا کہ وہ ماہتاب ہوتے گئے!

کسی کی آنکھ سے ٹپکے تو یوں لگا ہم کو،
ستارے ٹوٹ کے جیسے شہاب ہوتے گئے!

یہ اپنی چال کا تھا بانکپن کہ ہم ٹھہرے،
تھے گردِ راہ مگر آفتاب ہوتے گئے!

—

○

بکھر رہا ہے نیا رنگ ان فضاؤں سے،
چلی ہے شہر کو ڈولی کسی کی گاؤں سے!

دیارِ غیر کی جانب اُٹھے ہیں کس کے قدم،
لہو ٹپکنے لگا ہے مری وفاؤں سے!

سمجھ لیا اُسے میں نے سراغ منزل کا،
جو خاک اُڑتی نظر آئی تیرے پاؤں سے!

حقیقتوں میں فریب نظر کی بات نہ کر،
یہ دُکھ نہ مانگ محبّت کے پارساؤں سے!

مری نمود کو رستے بھی دے گئیں ظلمتیں،
فریب کھاتا رہا ہوں میں جن ہواؤں سے!

—

○

بجا کہ شعلہ کی صورت ہیں مشتعل نہ ہُوا،
مزاج میرا کسی آن معتدل نہ ہُوا!

فرار ہونے کو یوں تو کئی دریچے تھے،
ترا خیال مگر دل سے منتقل نہ ہُوا!

ہزار رنگ بھرا خونِ دل سے ہم نے مگر،
وفا کا نقش ترے دل پہ مستقل نہ ہُوا!

تری نگاہ سے لے کر ترے تصوّر تک ،
فسانۂ غمِ دل میں کوئی مخل نہ ہُوا !

وفا پرستوں پہ ایسا بھی وقت آیا ہے ،
ترا خیال بھی وجہِ سکونِ دل نہ ہُوا !

تمام عمر کٹی شرحِ زندگی کرتے ،
دل و نظر پہ عیاں رازِ آب و گل نہ ہُوا !

ہزار شدتِ غم میں کمی ہُوئی اظہرؔ ،
مگر حیات کا ماحول معتدل نہ ہُوا !!

—

○

میں گل کدۂ زیست میں آوارہ ہوا ہوں،
پت جھڑ سے خفا ہوں میں بہاروں سے جدا ہوں!

مدت سے مقید ہوں میں زندانِ وفا میں،
کس جرمِ تمنا کی سزا کاٹ رہا ہوں!

ماضی کی خبر ہے نہ مجھے حال کا ہے علم،
میں بھولتا جاتا ہوں کہ میں کون ہوں، کیا ہوں!

کچھ ہوش نہیں ہے مجھے مینا و سبو کا،
آنکھوں کے سمندر میں ہی میں ڈوب چلا ہوں!

ہر صبح کی اُمید کا ہر شام ہے ماتم،
خوش بخت ہوں میں مرگِ مسلسل میں جیا ہوں!

پھر لَوٹ کے آؤں گا میں تیری ہی گلی میں،
میں تیرا پرستار ہوں گنبد کی صدا ہوں!

مہتاب کا بربط ہے سدا ہاتھ میں میرے،
راتوں کی خموشی میں بھی میں نغمہ سرا ہوں!

کوئی نہیں محفل میں مرا، شمع کی مانند،
جلنا بھی پڑا مجھ کو تو تنہا ہی جلا ہوں!

اظہر سے تری اتنی بھی نفرت نہیں اچھی،
دیوانہ ترا ہوں، میں بُرا ہوں کہ بھلا ہوں!

○

تڑپ رہا ہوں کبھی مجھ سے ہم کلام تو ہو،
متاعِ شوق کو حاصل کوئی مقام تو ہو!

میں جاں بلب ہوں مری تشنگی مٹانے کو،
چھلکتا پھر تری آنکھوں سے کوئی جام تو ہو!

کبھی تو ہو تری آہٹ سے صبحِ نو کا ظہور،
بسی ہوئی تری سانسوں میں کوئی شام تو ہو!

وہ بات سُنتے تو شاید کدورتیں مٹتیں ،
شنیدِ حرفِ شکایت کا اہتمام تو ہو!

بہت ہی خوب رہی ہمسری شبِ ہجراں ،
رہا نہ زادِ سفر اب کہیں قیام تو ہو !

گرائی جائے نہ بجلی نہ آشیانے جلیں ،
مرے چمن میں بھی ایسا کوئی نظام تو ہو !

عیاں ہوں داغ، گریباں کے چاک کرنے سے ،
مگر کچھ ان کو دکھانے کا اہتمام تو ہو !

میں جس میں دیکھ سکوں عکسِ ماہ و سالِ اظہرؔ ،
اس آئینہ کی طرح سے مرا کلام تو ہو !

رُک کے جب بھی میں رہِ اُلفت میں سستانے لگا،
وہ کسی کہسار سے پھر ہاتھ لہرانے لگا!

اس طرح بکھری مری چہرہ بہ چہرہ داستاں،
دہر اس کو آپ بیتی کہہ کے دہرانے لگا!

اپنے کچھ زرخیز ذرّوں پر پڑی جب بھی نظر،
گو کہ تھا طوفاں زدہ میں پھر بھی اترانے لگا!

جب بھی پہنچی ہے مرے احساس تک تیری مہک ،
میں حوادث سے گزر کر پھول برسانے لگا !

خود شناسائی کے رستے میں تھے اتنے پیچ و خم ،
مجھ کو ہر انسان اک رہبر نظر آنے لگا !

مصلحت کا درس دینے لگ گیا ہر سنگِ میل ،
ہر اُلجھتی آرزو میں جب بھی سلجھانے لگا !

تیری یادوں نے سنبھالا ہے مجھے اکثر وہیں ،
میں جہاں صدموں سے گھبرا کر پھسل جانے لگا !

—

○

رونے سے گرچہ آنکھ کے پردے تو دُھل گئے ،
کچھ بھید تھے جو سارے زمانے پہ کُھل گئے !

یہ میرا اضطراب تھا یا تیرا اجتناب ،
کس کے کرشمے راز یہ سارے اُگل گئے !

جی چاہتا ہے چُوم لوں میں فرطِ شوق سے ،
وہ لب جو مجھ کو دیکھ کے حیرت سے کُھل گئے !

اب محوِ التفات ہوئے وہ حجاب میں،
ہم مٹ گئے تو وہ بھی بچانے پہ تُل گئے!

اظہر وہ زد رسیل کا دیکھا ہے آنکھ نے،
باندھے گئے تھے جتنے بھی دریا پہ پُل گئے!

---

○

یہ سارا انقلاب اُسی کی نظر کا تھا،
اس پر مجھے گمان کسی بے خبر کا تھا!

شب بھر نبھائی ہم نے ستاروں سے دوستی
مطلوب التفات تو رنگِ سحر کا تھا!

منزل ہی دُور تھی نہ شکستہ تھے پائے شوق،
قدموں کو احترام تری رہگزر کا تھا!

JAMIA HAMDARD
LIBRARY
New Delhi

اُڑتا جہاں میں پیار کی بدھم سی تال پر،
یارو کبھی یہ شوق بھی آشفتہ سر کا تھا!

دامن بچا کے کتنی بہاریں گزر گئیں،
کتنا عجیب حوصلہ سُوکھے شجر کا تھا!

کشتی کو پھر اُمید کے دھارے پہ چھوڑ کر،
اظہرؔ یہ سوچتا ہوں ارادہ کدھر کا تھا!

—

○

ہر ایک گام پہ دیکھے ہیں ہم نے اپنے نشاں،
کہیں فریب میں لت پت، کہیں غریقِ گماں!

ملا نہ کوئی بھی سوچوں کی آخری حد تک،
کچھ اس طرح سے رہی مہرباں شبِ ہجراں!

عجب سلیقہ سے جلتے رہے ہیں روح و بدن،
نہ دیکھے آگ کے شعلے، نہ پھیلا کوئی دھواں!

خدا کرے کہ تری اس طرف نظر اُٹھے،
بدل بھی دیتی ہے تقدیر ہمّتِ مرداں!

تری اُڑان میں حائل ہے خود تھکن تیری،
وگرنہ زد میں ہے تیری یہ گردشِ دوراں!

—

○

خوشبو کی طرح تُو مرے جب ہاتھ نہ آیا،
پھر خود سے ملاقات کا ڈھب ہاتھ نہ آیا!

جس وقت بھی کی میں نے خود آگاہی کی کوشش،
میرا ہی گریباں مرے کب ہاتھ نہ آیا!

چھانا ہے خیالوں نے بہت عالمِ امکاں،
کچھ تجھ سے محبّت کا سبب ہاتھ نہ آیا!

ہر جنبشِ لب سے ہُوئی احساس کی تشہیر،
لیکن وہ مرادرِ طلب ہاتھ نہ آیا!

بھاگا ہوں اندھیروں کے رگ وپے میں بہت میں،
تھا صبح کا عنوان عجب، ہاتھ نہ آیا!

ہر ذرّے کے گنبد میں توقّع کی لحد ہے،
ہے کون یہاں وجہِ غضب، ہاتھ نہ آیا!

اظہرؔ جو زمانے کی بدل دیتا ہے راہیں،
فن کار تو ہوں پر وہ ادب ہاتھ نہ آیا!

---

○

نظر اپنی ستاروں سے ہٹا لیتا تو اچھا تھا،
زمیں سے ہی کوئی گوہر اُٹھا لیتا تو اچھا تھا!

نہ کاندھا ڈھونڈتا غیروں کا رکھ کر ہاتھ چلنے کو،
میں اپنا راستہ خود ہی بنا لیتا تو اچھا تھا!

مرا احساس ہی دشمن رہا ہے آج تک میرا،
میں اپنے آپ سے خود کو بچا لیتا تو اچھا تھا!

چُرا لایا ہوں پھُولوں سے تری خوشبو کی شیرینی،
کہیں سے روپ بھی تیرا چُرا لیتا تو اچھا تھا!

جہاں میں اس فسانے کا کوئی عنوان تو ہوتا،
میں تیرا نام چہرے پر سجا لیتا تو اچھا تھا!

چمن میں ہر طرف بکھرے نظر آتے نشاں میرے،
میں اپنی دھجّیاں یوں بھی اُڑا لیتا تو اچھا تھا!

پشیماں کرتی جاتی ہے مجھے اُونچی نظر میری،
زمیں پر بوریا اظہرؔ بچھا لیتا تو اچھا تھا!

---

○

جہاں کھویا وہیں پایا گیا ہُوں،
کہیں بادِ صبا کا نقشِ پا ہُوں!

گماں ہوتا ہے تیری آرزو ہُوں،
تجھے اے حُسن! جب بھی سوچتا ہُوں!

ابھی تک ڈھونڈتا ہوں اُس شجر کو،
میں جس کی شاخ سے ٹُوٹا ہُوا ہوں!

ہواؤ میری خوشبو کو بکھیرو ،
کہ میں بھی صحنِ گلشن میں کھِلا ہوں !

مرے سینے پہ سب نے پاؤں رکھا ،
میں اظہرؔ جیسے کوئی راستہ ہوں !

---

میں آشنائی کا غم کس طرح بیاں کرتا،
تری طرح میں کسے اور بدگماں کرتا!

قدم قدم پہ تصادم رہا اندھیروں سے
میں اپنے خوں سے چراغاں کہاں کہاں کرتا!

جما ہُوا ہے ہر اک رُخ پہ یاسیت کا غبار،
کسے اُمید کی راہوں میں ہم عناں کرتا!

زمانے بھر میں نہیں کوئی غمگسار مرا،
میں اپنے غم کا بتا کس کو ترجماں کرتا!

مری پہنچ میں کہاں تیری قربتوں کی مٹھاس،
مرا نصیب کہاں تجھ کو ہم زباں کرتا!

تری طرح سے ترا غم بھی غیر ہو جاتا،
اگر ذرا سا بھی اظہر خیالِ جاں کرتا!

---

یہ زندگی ہے ترے ہاتھ میں شراب نہیں،
نہ ہاتھ کھینچ کہ یہ وقتِ اجتناب نہیں!

فریبِ دید سے یہ زندگی عبارت ہے،
وہ دشت کیا ہے کہ جس میں کوئی سراب نہیں!

ابھی پیالۂ مژگاں میں اور دے بھر کر،
شمارِ جُرعہ نہ کر، فرصتِ حساب نہیں!

یہ جستجو کا ہے عالم، مطالعہ سے نہ روک،
کہ تیرے چہرے سے بہتر کوئی کتاب نہیں!

مقامِ شکر کہ پھر بھی ہیں منفرد ٹھہرا،
کہ تیرے سامنے مجھ سا کوئی خراب نہیں!

اُٹھا بھی دے کہیں اظہرؔ حقیقتوں سے نقاب،
مگر ٹھہر کہ ابھی سامنے کی تاب نہیں!

---

○

زمانے بھر کے محبت میں زخم کھائے ہیں،
گلوں کی چاہ میں نکلے تھے، خار پائے ہیں!

کہو جنوں سے کہ کوئی شجر تلاش کرے،
مرے نصیب میں کب سے مہیب سائے ہیں!

قدم قدم پہ تھے راہوں میں خار بھی لیکن،
ہیں زخم گہرے جو پھولوں سے ہم نے کھائے ہیں!

ہزار بار اسی دل کے ورغلانے پر،
بڑے خلوص سے ہم نے فریب کھائے ہیں!

وہ حادثات ہی بڑھ کر مرا سہارا بنے،
یہ ڈگمگاتے قدم کب سنبھلنے پائے ہیں!

مرے مرض کا مداوا نہ ہو کہیں نشتر؟
بڑے علاج طبیبوں نے آزمائے ہیں!

اُنہیں بلاؤ کہ مسمار ہو چلے اظہرؔ،
تصوّرات میں جتنے محل بنائے ہیں!

—

○

ہائے کیا چہرے تھے جو میری نظر کو بھا گئے،
میرے ماضی کی حسیں یادوں کو پھر دہرا گئے!

میری آنکھیں اپنا پیکر دیکھ کر چندھیا گئیں،
آئینہ بن کر وہ میرے سامنے جب آ گئے!

دیکھنا چاہوں جنھیں مدّت سے، وہ چھو کر مجھے،
صورتِ خوشبو ہوا کے دوش پر لہرا گئے!

جن کو دعویٰ تھا کہ سلجھائیں گے ہر اُلجھن مری،
سامنے جب آ گئے تو اور بھی اُلجھا گئے !

ان نئے جادہ نوردوں کو بھلا بتلائے کون،
راستے کتنے سجیلے رہروؤں کو کھا گئے !

اس طرح بجھتے رہے اظہرؔ امنگوں کے چراغ،
پھول جیسے اپنی اپنی شاخ پر کملا گئے !

—

○

زندگی کا نشاں لہو تک ہے،
یہ چمن جشنِ رنگ و بو تک ہے!

جس کو سرچشمۂ خلوص کہوں،
اُس کا فیضان گفتگو تک ہے!

تیرا ملنا نصیب کی باتیں،
کام اپنا تو جستجو تک ہے!

پیار کا سجدہ کیوں قبول نہیں؛
سرنگوں اب تو آبرو تک ہے!

یہ الگ بات جل اُٹھے اظہرؔ،
ورنہ آنکھوں میں آبجو تک ہے!

—

○

ترے لیے نئی دنیا بسائے بیٹھا ہوں،
جہاں چراغ نہیں، دل جلائے بیٹھا ہوں!

یہ کائنات مجھے اجنبی سی لگتی ہے،
میں کنجِ ذات میں سر کو جھکائے بیٹھا ہوں:

کسی طرف سے تو آئے گی اب نسیمِ بہار،
ہر ایک راہ پہ نظریں جمائے بیٹھا ہوں!

## چہرہ بہ چہرہ

۷

مجھے بتاؤ کہاں جوئے شیر لانی ہے،
کہ میں بھی ہاتھ میں تیشہ اُٹھائے بیٹھا ہوں!

اُنھیں اُنہی کی نگاہوں سے میں کبھی دیکھوں،
فسردہ دل میں یہ حسرت چھپائے بیٹھا ہوں!

—

○

کیا عجب سیلِ رنگ و بُو ہوگا،
پیشِ منظر میں جب کہ تُو ہوگا!

پھر ترے موج موج جلووں سے،
کچھ تماشائے آرزُو ہوگا!

نہ سہی رسمِ التفات مگر،
چشمِ بینا کا تو وضو ہوگا!

## ۷۲

مٹ ہی جائے گا عالمِ من و تُو،
لب سے پیوست جب سبُو ہو گا!

قریہ قریہ تجھے میں ڈھونڈوں گا،
میرا افسانہ کُو بہ کُو ہو گا!

ولولوں نے لگائی جب مہمیز،
راہی منزل کے رُو برو ہو گا!

---

○

تیرے ہر رنگ میں اب جسم بھی تر لگتا ہے،
کتنا پُرکیف محبت کا اثر لگتا ہے!

کیا شکایت میں کروں تیرے ستم کی اے دوست،
اب مجھے اپنی وفاؤں سے بھی ڈر لگتا ہے،

جس کے سینے میں قناعت کا خزینہ ہو نہاں،
مجھ کو درویش بھی وہ صاحبِ زر لگتا ہے!

آج وہ بھی سرِ محفل نظر آتے ہیں اُداس،
مجھ کو ویرانیٔ دل کا اثر لگتا ہے!

چار سُو پھیلی ہُوئی نکہتِ صد رنگ کا رقص،
جانے کیوں مجھ کو تری راہ گزر لگتا ہے!

یہ شبِ ہجر ہے اظہرؔ نہ ستارے ہیں نہ چاند،
یہ شبِ ہجر اندھیروں کا نگر لگتا ہے!

—

○

جب بھی دل میں تری یادوں کو مچلتے دیکھا،
چشمۂ شعر و سخن ان سے اُبلتے دیکھا!

آشنا جب سے ہُوئی آنکھ ترے جلووں سے،
لمحہ لمحہ تری تصویر میں ڈھلتے دیکھا!

کون جانے کہ میں کیوں خود کو بدل ہی نہ سکا،
جبکہ ھر گام پہ رُخ تجھ کو بدلتے دیکھا!

چہرہ بہ چہرہ

۷۶

رہروانِ رہِ ہستی پہ ہے عظمت بھی نثار،
جن کو ہر گام پہ گر گر کے سنبھلتے دیکھا!

کچھ تو نکلے گا ترے پہلو سے اے ہجر کی شب،
میں نے ہر رات سے سورج کو نکلتے دیکھا!

کتنا معصوم ہے اظہر دلِ انساں کہ جسے،
ہم نے خواہش کے کھلونوں سے بہلتے دیکھا!

—

○

دکھا دے گردشِ دوراں تمہی اب راستہ کوئی،
لیے پھرتا ہے پہلو میں متاعِ بے بہا کوئی!

وہ جلوہ جب سے دیکھا ہے یہی ارمان ہے دل کو،
نگاہِ لطف سے بارِ دگر بھی دیکھتا کوئی!

تغافل آگیا اُس کی تلاطم خیز نظروں میں
مرے اوسان پر پوری طرح جب چھا گیا کوئی!

کوئی لمحہ بھی گزرا تو یہی حسرت لیے گزرا،
مرے کانوں کو چھوتی تیرے ہونٹوں کی صدا کوئی!

میں اُن بے چین سانسوں کو سکوں سے آشنا کر لوں،
اگر تیرے تنفس میں ملے موجِ صبا کوئی!

نہیں ممکن نظر آتا مجھے اذنِ رسائی ہو،
وفا در! تم ہی جا کر ڈھونڈ لو اس کی رضا کوئی!

نہ منزل دُور تھی اتنی نہ تھا بے دست و پا اظہر
ملا مجھ کو نہ اس دشتِ جہاں میں رہنما کوئی!

—

○

شبِ ہجراں مجھے رنگِ سحر تک تو جگا لائی،
تمنّا ؤ اُٹھو شاید کہ پھر ہو جشنِ بینائی!

اگرچہ تجھ سے دُوری میں بھی تکمیلِ محبّت ہے،
مگر میری وفا پھر بن گئی تیری تمنّائی!

یہ پروازِ تصوّر اب کہاں تک آسرا دے گی،
مری راہوں میں حائل ہے مری ہی آبلہ پائی!

بہت لائے گئے ہیں چاند، تارے آسمانوں پر،
مگر پھر روشنی میری زمیں تک کیوں نہیں آئی!

مری بے چینیاں راہِ سخن تک آن پہنچی ہیں،
اب آگے کون سی راہوں سے جانے ہو شناسائی!

چھپائے کیوں نہ رکھوں دل میں طوفانِ بلاظلم
مری فریاد میں باقی نہیں ہے تابِ رسوائی!

---

○

خونِ دل سہمی ہُوئی آنکھ نے ٹپکایا ہے،
پھر کوئی بھولا ہُوا حادثہ یاد آیا ہے!

جب بھی صحرا پہ نمودار ہُوا ہے سُورج
راستہ اور بھی دشوار نظر آیا ہے!

میرے گردوں سے اُمڈتے ہُوئے بادل نہ چھٹے،
میں تو سمجھا تھا کہ اب چاند نکل آیا ہے!

بارہا آیا اُسی بادِ بہاری کا خیال،
جس کے جھونکوں نے ترے دام میں الجھایا ہے!

اُن کا کہنا تھا، بدل ڈالیں گے اندازِ چمن،
دامنِ گل پہ وہی دھول، وہی سایہ ہے!

ہوں گی اک روز بیاباں میں بہاریں رقصاں،
دل کو اظہر، اُسی اُمید نے بہلایا ہے!

—

○

حنائی انگلیاں یاد آ رہی ہیں،
مری آنکھیں لہو برسا رہی ہیں!

گلے مل لوں ذرا میں اُن سے جا کر،
اُمیدیں ہو کے برہم آ رہی ہیں!

ہوا لائی اُٹھا کر کیسی مٹی،
وفائیں دب کے مرتی جا رہی ہیں!

کہوں کیسے امیرِ کارواں سے،
یہ راہیں کیا مجھے سمجھا رہی ہیں!

یہ کیا منظر لیے پھرتا ہے بادل،
کہ بوندیں گر کے بھی ترسا رہی ہیں!

میں اظہرؔ غم کی راہوں پر رواں ہوں،
وفائیں مشعلیں دِکھلا رہی ہیں!

—

○

دہر میں اخلاص کو ڈھونڈوں کہاں ،
ہر طرف مطلب پرستی کا دھواں !

اس پہ پرواز تخیّل کیا کرے ،
فاصلے جب قربتوں میں ہوں نہاں !

پھول ہوں تو کس نے رنگت چھین لی ،
خار ہوں تو سایۂ گل ہے کہاں !

زرد چہروں کے پسِ پردہ بھی دیکھ،
سرخیاں شاید جنم لے لیں وہاں!

مجھ سے برہم ہے زمیں کی خاک بھی،
کیوں دکھائی جا رہی ہے کہکشاں!

جب کسی کے عیب پر ہو گی نظر،
کب اُجاگر ہوں گی اُس کی خوبیاں!

اب چلو اظہرؔ کریں راہیں تلاش،
بن گیا ہے شوقِ منزل زخمِ جاں!

---

○

وہ بے رخی کا پہنے لبادہ نکل گیا،
میں تشنہ کام بن کے ارادہ نکل گیا!

نفرت کی اور چاہ کی منزل تو ایک تھی،
وہ حد سے بڑھ گیا میں زیادہ نکل گیا!

یاد مجھے تو راہِ الم کی نہ تھی تلاش،
میں اتفاق سے سرِ جادہ نکل گیا!

ساقی بوقتِ لطف کسے تم پلاؤ گے،
جب مے کشوں سے ہوش کا مادہ نکل گیا!

اس سے تو ایک عمر کا پیمانِ عشق تھا،
کیوں مے کشی کا دل سے ارادہ نکل گیا!

اظہرؔ ذرا حدودِ تمنّا سے بھی گزر،
ہاں اُٹھ کہ اب تو جام سے بادہ نکل گیا!

—

○

اپنا سوچا کیا کرے کوئی،
بات تو برملا کرے کوئی!

ایک ویرانہ بن چکا ہے دل،
اب نہ اس میں رہا کرے کوئی!

آنکھ بھر آئے اک زمانے کی،
یوں جہاں سے اُٹھا کرے کوئی!

زہر پھانکوں کسی کے ایما پر،
میرے حق میں دعا کرے کوئی!

جب تمنّا کسی کی ہو بیدار،
رُو بہ رُو بھی ہُوا کرے کوئی!

---

○

قربتیں جب تک رہیں گلزار کی،
یوں نہ کملائیں کلیاں پیار کی!

سانس شاید اس لیے آتی رہی،
آس تھی مجھ کو تری مہکار کی!

آرزو ہوتی گئی اُتنی بلند،
تُو نے اونچی جس قدر دیوار کی!

دے گئی میرے تجسّس کو جِلا،
ہر نئی صورت ترے انکار کی!

پھر کوئی لغزش پسِ پردہ نہ ہو،
آرزو ہے پھر ترے دیدار کی!

کس نے رکھا تھا مرے گھر میں قدم
دے گیا صورت مجھے فنکار کی!

غم سے آلودہ ہے سوچوں کا جہاں،
مٹ نہ جائیں رفعتیں کردار کی!

تہہ بہ تہہ سلگی ہُوئی ہیں خواہشیں،
جل رہی ہیں نکہتیں افکار کی!

---

○

مرے ہی روپ میں وہ ڈھل رہا ہے،
جو میری آنکھ سے اوجھل رہا ہے!

گری تھی برق کل میرے چمن میں،
نشیمن میرا اب تک جل رہا ہے!

وہ غم کا ناگ مجھ کو ڈس رہا ہے،
جو میرے ہی لہو پر پل رہا ہے!

نجانے کس کی نظروں سے گرا ہے،
کفِ افسوس کوئی مل رہا ہے!

کہے جاتا ہوں آنکھیں بند کر کے،
کہ اب طوفان شاید ٹل رہا ہے!

خرد مندی پہ کیا گزری ہے اظہرؔ
ضمیرِ عشق کیوں بوجھل رہا ہے!

—

چہرہ بہ چہرہ

۹۵

○

رہِ وفا میں ہیں آلام زندگی کے لیے،
تمام عمر بھٹکتے رہے خوشی کے لیے!

وہ جس کی ایک نظر زندگی کا حاصل تھی،
اُسی نے ہاتھ بڑھایا نہ دوستی کے لیے!

قدم قدم پہ مجھے جس نے رنج و غم بخشے،
تڑپ رہی ہے نگاہِ طلب اُسی کے لیے!

ہزار خار چھبے اُن کی پتّی پتّی میں ،
اگرچہ پھول چمن میں کِھلے ہنسی کے لیے !

کہاں تلاش کریں ہم خلوص کی دولت ،
کسے پکاریں زمانے میں دوستی کے لیے !

میں راہِ منزلِ مقصود کی وہ مشعل ہوں ،
جلا رہا ہے جسے کوئی روشنی کے لیے !

—

○

اُن کا سودائے ستم تا بہ ابد خام رہا،
ہم کو بھی اُن کی جفا سہنے سے ہی کام رہا!

جب بھی دیکھا اُنھیں اپنے سے گریزاں دیکھا،
ذکر اُن کا ہی یہاں صبح سے تا شام رہا!

میں رہا ہو کے بھی اُڑنے کے نہیں ہوں قابل،
میں کہ اک عمر بھر رنگ تہِ دام رہا!

اُن کا پر تو کہیں دیکھا تو ہوئی خیرہ نظر،
ہم پہ اس وجہ سے ہرجائی کا الزام رہا!

ایک ہم ہی تھے کہ رکھے گئے محرومِ کرم،
ورنہ محفل میں ترا فیض بہت عام رہا!

تشنگی کیسے مٹے کوئی بتائے اظہرؔ،
ایک قطرہ جو ملا، وہ بھی تہہِ جام رہا!

—

○

ہجومِ غم میں پھر دل کھل اُٹھا ہے،
ہُوئی ہے شام پھر روشن دیا ہے!

چلا جاتا ہے از خود سُوئے مقتل،
دلِ عُشّاق دنیا سے جُدا ہے!

جلائے گا جو جلتا ہے جہاں میں،
تو پھر یہ شمع سے کیسا گلہ ہے!

کِھلاتی ہے یہ گُلہائے تمنّا،
مری موجِ نفس موجِ صبا ہے!

ہَوا آئی کہ تیری یاد آئی،
دریچے کا یہ کیوں پردہ ہلا ہے!

مری پہچان میری شاعری ہے،
مرا ہر حرف میرا آئینہ ہے!

—

○

تلخیٔ حالات نے پینے پہ اُکسایا مجھے،
یا کسی بھُولے ہُوئے نے یاد فرمایا مجھے!

مے نہیں قسمت میں تو پھر مے پرستی چھوڑ دے،
ہاں مگر یہ مشورہ بھی راس کب آیا مجھے!

آبرو توبہ کی ڈوبی ساغرِ گل رنگ میں،
ہر تلاطم گھیر کر اِس موڑ پر لایا مجھے!

میں کہاں، بادہ کہاں، نغمہ کہاں، ساغر کہاں،
آپ کی مخمور سی نظروں نے بہکایا مجھے!

دل کے آئینے میں دیکھا ہے ترا عکسِ جمیل،
دل کا آئینہ ہی تیرے سامنے لایا مجھے!

مے نہیں ساقی اگر مینا اُٹھا کر توڑ دے،
وعدۂ فردا میں تونے کیوں ہے اُلجھایا مجھے!

ہر قدم پر میں رہا ہوں خود فریبی کا شکار،
ہر قدم پہ دل نے اظہرؔ لاکھ سمجھایا مجھے!

---

○

اُسی کی یاد رہی دل میں حرزِ جاں ہو کر،
وہ مجھ سے رُوٹھ گیا ہے، جو بدگماں ہو کر!

"تمھی ہو جانِ تمنّا، تمھی ہو جانِ غزل"
کہوں میں اُس سے سُنے گر وہ مہرباں ہو کر!

شگفتہ دل تھا مرا راحتوں کا گہوارہ،
وہ رہ گیا ہے فقط اب ترا مکاں ہو کر!

ادھر نگہ میں تغافل، ادھر تڑپ دل میں،
میں پس کے رہ گیا ان دو کے درمیاں ہو کر!

وہ اپنی یاد بھی چھینے تو کیا کہوں اس کو،
چمن اُجاڑ رہا ہے جو باغباں ہو کر!

کوئی بتائے کہ اب میں انھیں چھپاؤں کہاں،
وہ شعلے دل سے نکلتے ہیں جو دھواں ہو کر!

—

○

شکوہ کسی سے اب مری عادت نہیں رہا،
ہونٹوں پہ کوئی حرفِ شکایت نہیں رہا!

یا تیرے سامنے نہیں، منشورِ آگہی،
یا مجھ میں اب وہ ذوقِ اطاعت نہیں رہا!

کیا ہے جو آج پڑ گئے کمزور ولولے،
کچھ بھی ہمیشہ ایک سی حالت نہیں رہا!

میرے مسیح میرے دُکھوں کا علاج کر،
ان کا علاج طرزِ خطابت نہیں رہا!

سچ کی تلاش سخت کٹھن مرحلہ ہُوا،
اب جھوٹ چونکہ کارِ ذلالت نہیں رہا!

---

○

مجھے عزیز یہ تنہائی ہوتی جاتی ہے،
وسیع تر مری پہنائی ہوتی جاتی ہے!

بکھرتا جاتا ہوں سورج کی روشنی کی طرح،
جہاں جہاں مری شنوائی ہوتی جاتی ہے!

میں اپنے داغ دکھاتا ہوں چاند تاروں کو،
بڑی بلند شناسائی ہوتی جاتی ہے!

کہاں کہاں پہ ہوں بچھڑا، کہاں کہاں کھویا،
مرے وجود میں تنہائی ہوتی جاتی ہے!

میں حرفِ زیست کی صورت بکھرتا جاتا ہوں،
نجانے کیوں مری رسوائی ہوتی جاتی ہے!

اب اس مقام پہ پہنچا ہے منتظرؔ اظہرؔ،
جہاں پہ آس بھی سودائی ہوتی جاتی ہے!

—

○

سکوں ملتا ہے ذہنوں کی جلن کو،
خدا رکھے تمھاری انجمن کو!

اماں غیروں کے دامن میں نہیں ہے،
رفو کر آپ اپنے پیراہن کو!

ذرا انصاف کی مشعل جلا کر،
ابھارو عظمتِ دار و رسن کو،

پسینے سے زمیں سیراب کر دو،
سجانا چاہتے ہو گر چمن کو!

چٹانوں پر ہے سنّاٹوں کا عالم،
دلِ شیریں سے ڈھونڈو کوہکن کو!

غبارِ رہگزر بھی ہے غنیمت،
چھپانا ہے مجھے ننگے بدن کو!

قیامت ہے یہ ناقدری کا عالم،
یہ دیمک چاٹ لے گی اہلِ فن کو!

---

○

شاید کہ میرے پاس وہ قلب و نظر نہیں،
کیوں اپنے حالِ زار سے میں باخبر نہیں!

اپنا مقام بھول کے بھٹکا ہوں دربدر،
کیا میرے پاس آج مرے بال و پر نہیں!

کیوں بٹ گیا ہوں آج میں سُرخ و سفید میں،
میرا جنوں بھی آج مرا ہمسفر نہیں!

دنیائے حسن و عشق پہ ہر سُو بہار ہے،
کیوں میری شامِ غم کا مقدّر سحر نہیں!

مجبور ہو چکا ہوں میں کچھ اس طرح کہ آج،
نالے تو بے کراں ہیں مگر پُر اثر نہیں!

میں حادثوں سے خوف تو کھاتا نہیں، مگر،
منزل تو سامنے ہے، کوئی راہبر نہیں!

—

○

ترا وجود مرا انکشاف ہو جیسے،
مری وفاؤں کا اک اعتراف ہو جیسے!

مرا وجود ازل سے ہے ایسے گردش میں،
کہ میری زیست ترا ہی طواف ہو جیسے!

تری نگاہ مجھے اس طرح تلاش کرے،
مرا وجود کوئی کوہِ قاف ہو جیسے!

خوشی کی موج مجھے چھُو کے یوں گزرتی ہے
حقیقتوں سے اُسے انحراف ہو جیسے!

کرن کرن ترے پیکر میں ڈھل کے یوں پھُوٹے،
ہر ایک صبح ترا انکشاف ہو جیسے!

مرے ہی جسم کی حدّت جلا گئی مجھ کو،
مرا وجود ہی میرے خلاف ہو جیسے!

اُڑوں کچھ ایسے سدا میں ترے تعاقب میں،
مری لگن کو قناعت معاف ہو جیسے!

---

○

اُن کی نسبت سے محبت کا گنہگار نہ کر،
عشق اک جُرم ہے اس جرم کا اظہار نہ کر!

راکھ کے ڈھیر میں اب بھی ہیں سلگتے ارماں،
کہنے دے رازِ دروں ضبط پہ اصرار نہ کر!

نام تک بھی نہ رہے اہلِ جنوں میں میرا،
میرے خوابوں کا محل اتنا بھی مسمار نہ کر!

میرے ہمدم مرے اخلاص پہ پہرے نہ بٹھا،
یوں پشیمان مرا جذبۂ ایثار نہ کر!

اب نہ یوں دیکھ مجھے پیار بھری نظروں سے،
میری خوابیدہ تمنّاؤں کو بیدار نہ کر!

میں شناسائے تلاطم ہوں تمنّا ہے بھنور،
مجھ کو خاموش کناروں کا طلب گار نہ کر!

تیری آشفتہ سری گُل نہ کھلا دے کوئی،
گرمیٔ عشق میں جل درد کا اظہار نہ کر!

—

○

مرا دل بے کلی میں اس قدر ہے،
زمانے کو کہاں اس کی خبر ہے!

نہ کوئی راز داں اپنا نہ محسن،
فقط اک یاد ہے جو ہمسفر ہے!

ترے جلوے کہاں تک بچ سکیں گے،
تعاقب میں زمانے کی نظر ہے!

بڑی پُر پیچ ہے منزل ہماری،
بڑی ہموار تیری رہگزر ہے!

نظر آئی نہیں کوئی کرن تک،
سحر ہے اور قیامت کی سحر ہے!

کٹھن ہے راہ پھر بھی تُو چلے جا،
اگر منزل کی عظمت پر نظر ہے!

میں خونِ دل بھی فرشِ راہ کر دوں
اگر اظہر یہ تیری رہگزر ہے!

—

○

خود کیا جرمِ وفا، اس کی سزا ہو کہ نہ ہو
درد خود مانگا تو اب اس کی دوا ہو کہ نہ ہو!

گونج اُٹھی ہے مرے نالوں سے خاموش فضا،
تیری تہذیب میں یہ بات روا ہو کہ نہ ہو!

ملتی جائے گی تجھے میری صداؤں سے خبر،
ڈھونڈنے والے تجھے میرا پتہ ہو کہ نہ ہو!

ہم نے سینچا ہے خزاں میں بھی پسینے سے چمن،
مشکبار اُس کی بہاروں سے ہَوا ہو کہ نہ ہو!

زیرِ تفتیش رہے جرم ہمیشہ میرا،
مجھ کو ڈر یہ ہے کہ پھر مجھ سے خطا ہو کہ نہ ہو!

اُن کا ہر نقشِ قدم صورتِ گُل تھا اظہرؔ،
اُن کی رفتار میں اندازِ صبا ہو کہ نہ ہو!

—

○

سوچتا ہوں گر مجھے ملتی نہ یوں تیری ضیا ،
تیرگی میں زندگی کو کس طرح سے کاٹتا !

تُو جو مجھ میں تھا تو پھر غم کا نہ تھا کوئی جواز ،
میں فقط اپنی انا کی آگ میں جلتا رہا !

پھر مجھے چھُونے لگی تیرے چمن کی تازگی ،
پھر وفائیں ڈھونڈنے نکلیں ترا رنگِ حنا !

جب تری گفتار کا انداز ہے سب سے الگ،
کیوں نہ پھر طرزِ فغاں میری بھی ہو سب سے جُدا!

میری فطرت میں نہاں روحِ فقیری ہے مگر،
یہ نہ دیکھو کیوں نہیں صد چاک اظہرؔ کی قبا!

—

○

نُور بن کر مرے ماتھے پہ سنور جاتا ہے،
جو بھی منظر مری نظروں سے گزر جاتا ہے!

دُکھ رچا ہے مرے ماحول کی شریانوں میں،
سانس لیتا ہوں تو سینے میں اُتر جاتا ہے!

دوڑ آیا ہوں تمنّا سے چُرا کر نظریں،
جیسے آہُو کسی آواز سے ڈر جاتا ہے!

یوں اُترتا ہے کوئی روح کی گہرائی میں
جس طرح جھیل میں مہتاب اُتر جاتا ہے!

دل میں رکھوں تو قیامت سی گزر جاتی ہے،
لب کُشا ہوں تو ترا نام بکھر جاتا ہے!

کیسے دیکھوں میں تری راہ گزر سے آگے،
تو ہی تو ہے جہاں احساسِ نظر جاتا ہے!

تیری محفل ہے وہ محفل کہ جہاں پر ٹھہرے،
جو بھی آتا ہے وہ با دیدۂ تر جاتا ہے!

—

○

پایا تو میں نے خوب تری کائنات کو،
اس میں سمو سکا نہ مگر اپنی ذات کو!

بے بس ہُوا تو چُن کے میں سینے سے داغ داغ،
دینے لگا ہوں روشنی ہجراں کی رات کو!

ہر سُو مرے چمن میں ہیں بے چینیاں رواں،
کوشش میں ہوں کہ ڈھونڈ لوں راہِ نجات کو!

تیرے تصوّرات سے لے کر کرن کرن،
ترتیب دے رہا ہوں میں اپنی حیات کو!

تیرا ہر ایک لفظ ہے تسکینِ آرزو،
کرتا ہوں دل پہ نقش تری بات بات کو!

آکر نہ لوٹ جائے کہیں پھر سے فصلِ گل،
سرسبز شاخ پہ نہ سجا سوکھے پات کو!

اس آبشارِ درد سے نغمے بکھیر کر،
اظہرؔ پکارتا ہوں ترے التفات کو!

—

O

ایسا موسم ہے کہ کھُلتے نہیں کردار ابھی
اندھے ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں تلوار ابھی!

اپنا غم خود کو سُنا لوں تو کوئی بات بنے،
میری قسمت میں نہیں ہے کوئی غم خوار ابھی!

تُو نے جو میری تمنّا کے عوض بخشا ہے،
میری ہستی ہے اُسی درد سے دوچار ابھی!

میں نے دیواریں سجا دی ہیں چراغوں سے مگر؛
کیوں نظر آئے نہیں صبح کے آثار ابھی!

میں تجھے ڈھونڈ کے لوٹا ہوں جہاں سے ہمدم،
جھنجھناتی ہے وہیں پر تری جھنکار ابھی!

میری سوچوں میں تو ہے منزلِ مقصود مگر،
میرے ہاتھوں میں نہیں وقت کی رفتار ابھی!

مجھ کو بھی سامنا کرنے کی نہیں ہے طاقت،
اُس کو بھی سامنے آنے سے ہے انکار ابھی!

بن چکی ہے جو رگِ جاں کا پُرانا ناسور،
وہ مسرّت ہے مری روح سے بے زار ابھی!

کیسے مانوں کہ تجھے بھول چکا ہوں اظہر،
جب مری روح سے آئے تری مہکار ابھی!

○

کبھی تو میرے نصیبوں میں وہ گھڑی ہوگی،
خزاں گزیدہ چمن میں بہار بھی ہوگی!

قدم قدم پہ جلائے ہیں زندگی کے چراغ،
خیال یہ تھا کہ ہر گھر میں روشنی ہوگی!

مرے تڑپنے پہ نالاں، مرے مرض سے گریز،
کسے نصیب مسیحا یہ دوستی ہوگی!

کبھی تو جانِ تمنّا بنامِ مے خانہ،
مری وفا کو پکار و تو بات بھی ہوگی!

مرا سفینہ تلاطم سے آشنا نہ ہُوا
تو خاک، موجِ تلاطم کی زندگی ہوگی،

ہمارے بعد ترس جائے گی ہمیں دنیا،
ہمارے واسطے لیکن یہ اجنبی ہوگی!

—

○

میرا وجود صورتِ خوشبو بکھر گیا،
جھونکا ہوا کا آج کدھر سے گزر گیا!

یہ درد و کرب تیری اداؤں کا تھا صلہ،
الزام میری آنکھ کے پانی کے سر گیا!

آیا تھا رنگ بن کے مرے گھر میں وہ کبھی،
میرے لہو سے میرے ہی آنگن کو بھر گیا!

یارب کسی کے حوصلۂ ضبط کی ہو خیر،
کوندا ہزار کرب کا سر سے گزر گیا!

مہکائے ہیں نے تیری فضا میں گُل وسمن،
میں مٹ کے زندگی کی رگوں میں اُتر گیا!

اظہرؔ یہ فیض بھی دمِ عارف کا ہے کہ میں،
کون و مکاں میں صورتِ نغمہ بکھر گیا!

—

# فردیات

◎

میری الفت کی کہانی کچھ نہیں اس کے سوا،
میں اندھیرے میں رہا اور نام روشن ہوگیا!

○

درد کے شعلے مجھے اُتنا عیاں کرتے گئے،
جس قدر چھپتا رہا اظہرؔ میں اپنی ذات میں!

○

میں تیری بزم کی رخشندگی کی خاطر سورج!
کہاں کہاں سے اُٹھا کر چراغ لایا ہوں!!

○

طوفاں کے تُند جھونکوں سے جھڑنے لگے ہیں پات،
شاید میں بن رہا ہوں علامت بہار کی!

○

اپنی بربادی کا باعث اُس نے بھی سمجھا مجھے،
میں نے جس پر اپنا مستقبل نچھاور کر دیا!

○

موسموں کی تیغ سے گو بال و پر کٹتے رہے،
پھر بھی میں شاداب منزل کی طرف اُڑتا رہا!

○

نجانے کون سی منزل ہو آگے،
ابھی تو ہاتھ پہنچے ہیں قمر تک!

○

چاند اور سورج سجا کر جا رہا ہوں عرش پر،
نور برسائیں گے تجھ پر رات دن یہ میرے بعد!

○

میں کہ تھا تیری تمنّا، رُک نہ سکتا تھا کہیں،
یورشِ غم بھی مرا زادِ سفر بنتی گئی!

○

میں نقشِ پائے تمنا سہی مگر اظہرؔ،
عروجِ زیست کی راہوں کا رہنما بھی ہوں!

○

میرے چہرے سے نہ پڑھ اظہرؔ مرے احوالِ دل
ڈوب جا مجھ میں کہ ہے سب کچھ مری گہرائی میں!

○

رو دیا ہوں گردشِ دوراں پہ نظریں ڈال کر!
جب کھنڈر میرے مری سوچوں کی زد میں آ گئے

○

اپنا آنچل ہلائے جاؤ تم،
بن ہوا کے دیئے نہیں جلتے!

○

مجھ کو حسرت ہے کہ چمکوں کبھی کندن کی طرح،
پھینک دے کوئی مجھے دہر کے انگاروں میں!

○

بن کے جگنو گھنے اندھیروں میں،
تیرا جلوہ تلاش کرتا ہوں!

○

یہ کون اس قدر مجھے ویران کر گیا،
جھانکوں جو اپنے آپ میں، صحرا دکھائی دوں!

○

میری آنکھوں کے سمندر سے کہو،
میرے دل کی سرزمیں بھی خشک ہے!

○

میں جلا کر خود کو غم کی آگ میں،
بانٹنے نکلا ہوں اظہرؔ روشنی!

○

تھی کس غرور کے پردے میں ناقدوں کی نظر،
کوئی بھی ہاتھ نہ پہنچا مرے گریباں تک!

○

اُتر گیا ہوں غموں کے سمندروں میں تو کیا،
ہزار خوشیوں کے گوہر میں لے کے اُبھروں گا!

○

درد کی لذّت سے اظہرؔ اس قدر مانوس ہوں،
زخم بھر جائیں تو پھر کانٹے چبھو لیتا ہوں میں!

○

غوطہ زن ہو کے میں اس بحر سے موتی چُن لوں!
راستہ مجھ کو بتا دل میں اُتر جانے کا!

○

شاید تری بہار کو حاجت تھی نور کی،
کھولے جو ہونٹ میں نے، تو شعلے نکل پڑے!

○

دیکھنا چاہوں تجھے شہرت کے جس مینار پر،
آرزو ہے اُس کی بنیادیں فراہم کر سکوں!

○

اشک بن کر جس زمیں میں ہو رہا ہوں جذب میں،
آرزو ہے وہ بہاروں کو جنم دیتی رہے!

○

اُٹھاؤ اپنے تبسّم کی آنچ دے کے مجھے،
پڑا ہُوا ہوں میں آہوں کے سرد خانے میں!

○

ہرچند اپنے سر پہ اُٹھائے ہوں بارِ غم،
پھر بھی ترے جہاں کا سفر دل پذیر ہے!

○

اُڑائے پھرتی ہے مجھ کو دُکھوں کی تیز ہَوا
میں اپنی تہہ میں اُتر پاؤں کس طرح اظہرؔ!

○

جس کی چاہت نے جلایا ہے جہنم کی طرح،
اُس کا پانا بھی قیامت سے گزرنا ہوگا!

○

مجھ کو آنسو جان کر ٹپکا نہ اپنی آنکھ سے
ایک دن شاید تجھے کرنی پڑے میری تلاش !

○

اس دل سے نکلتے ہوئے شعلوں کو ہوا دو،
مطلوب ہے اظہر ابھی کرنوں کو بکھرنا

○

یہ فیصلہ تو کرے گی نگاہِ ناز تری
وفا کا جرم کہاں تک سزا کے قابل ہے !

○

کہہ رہے ہیں رات کے تیور کہ ہے نزدیک صبح،
ساتھ دے اے بے قراری ! سو نہ جاؤں میں کہیں !

○

اے مری شاداب منزل ! تو ہی اب یہ راز کھول،
فاصلہ جتنا گھٹا، کیوں دوریاں اتنی بڑھیں !

○

مری راہوں میں کس نے درد کے موتی بکھیرے ہیں،
بتاؤ کون کہتا ہے محبّت میری آہوں سے!

○

نہ جانے کیوں تری محفل میں جب بھی آ پہنچا،
گرے ثواب کے قطرے مرے گناہوں سے

○

کرب کا سورج سوا نیزے پہ تھا اظہرؔ مگر،
حسن کی پرچھائیاں مجھ کو سکوں دیتی رہیں!

○

درد سے اظہرؔ اُٹھا کر میں نے دل کی کرچیاں،
رکھ دیا ہے ڈھال کر آئینہ تیرے سامنے!

○

راہِ ہستی میں مجھے مثلِ شجر استادہ کر،
آرزو ہے رہرووں میں اپنی چھاؤں بانٹ دوں!

○

موت کے آشوب سے منکر نہیں ہوں میں مگر،
اُڑ رہا ہوں تاکہ اظہر کچھ بلندی سے گروں!

○

گھورتی ہیں سب کی نظریں مجھ کو اس انداز سے
میں ہوں اظہر صبحِ نو کا جیسے تازہ انکشاف!

○

اپنی پیشانی کا جھومر مجھ سے چمکا دے کہ میں،
برق پارہ ہوں تمھاری آنکھ سے ٹپکا ہُوا!

○

دیکھ کر تو ہی بتا اظہر مجھے
میرا چہرہ کونسا بہروپ ہے!

○

تُو روشنی کی طرح بانٹ دے مجھے یارب،
جہاں کی تیرہ نصیبی مجھے قبول نہیں!

○

اپنی تنہائی کے احساس سے رویا ہوں بہت،
جب بھی میں نے کوئی چاہا ہُوا انساں دیکھا!

○

میں کھڑا تھا راستے پر رہنمائی کے لیے،
ہر مسافر نے مجھے اؔظہر نوازا دھول سے!

---

کائنات فنونِ لطیفہ کا سرچشمہ ہے اور کیونکہ ہر فن صرف اسی حقیقت سے متعلقہ خیالات کی ترسیل کا مجاز ہے جو کسی نہ کسی طور پر کہیں نہ کہیں موجود ہو، لہٰذا صرف وہی فنکار رفیع تسلیم کیا جا سکتا ہے، جو فن کو ایک انکشافی سچائی کی حیثیت میں پیش کرنے پر قادر ہو!

**نعیم اظہر** ادب کے آسمان کا ایک ایسا رخشندہ ستارا ہے، جو اپنی کومل کرنوں میں زندگی کی اعلیٰ اقدار کی آمیزش کرتے ہوئے فنِ شاعری کی وساطت سے انسان کو اُن حقائق سے رُوشناس کرواتا ہے، جو روزمرہ کی اُن تمام تر تلخیوں پر مبنی ہیں، جنھیں ہمارے معاشرہ کے بالادست طبقات نے زیرِ دست طبقات کی زندگی کا حصّہ ہی نہیں بنا دیا۔ بلکہ سماج میں استحصال ایسی لعنت کو فروغ دینے میں بھی مؤثر منفی اقدامات کیے ہیں' —— اسی سبب سے **نعیم اظہر** اپنی کتاب "چہرہ بہ چہرہ" میں اپنے ہم عصر دوسرے فنکاروں کے ہمراہ مفاد پرست اور انسانیت کش عناصر سے ہر گھڑی برسرِپیکار نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ عمل اُن سے نئے نئے انکشافات کرواتے ہوئے جہاں قارئین کو زندگی کے لامحدود امکانات کے حوالے سے حیرت سے مالا مال کرتا ہے، وہاں انھیں ایک ایسی انجانی خلش میں بھی مبتلا کرتا ہے، جو انھیں ناخوشگوار عمرانی صورتِ حال کی تبدیلی پر آمادہ کرتی ہے!

**یوسف مثالی**

۲۰ رجون ۱۹۷۷ء

"جہاں تک یوسف مثالی کی فردیات میں منکشف ہونے والی شعری شخصیت کا تعلق ہے، وہ سرتا سر پیغمبرانہ ہے۔ ان کی فردیات سے ہمیں اعلیٰ ترین انسانی جذبات و احساسات کا جمالیاتی اظہار بڑے بھرپور انداز میں میسّر آتا ہے۔ وہ انسانی دکھوں کے مشاہدے سے آزردہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ان دُکھوں کا مداوا تلاش کرنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اور جب تک ان کی سرگردانی کامرانی سے ہمکنار نہیں ہو جاتی وہ ان دُکھوں سے دوسرے انسانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے وجود کو ان کے سامنے ڈھال بنا دینا چاہتے ہیں۔"

عارف عبدالمتین


یوسف مثالی — کی فردیات کا مجموعہ

# لمحوں کے سائے

بہترین گٹ اپ — قیمت : پندرہ روپے

نوروز پبلشرز۔ لاہور